© rasailojaraid.com

از مولانا محمد طاسین کراچی

بیمہ شریعت کی نظر میں

شریعت اسلام کی روشنی میں معاملہ بیمہ کی جو حیثیت متعین ہوتی ہے اس کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ مختصر طور پر معاملہ بیمہ کی حقیقت اور ہیئت ترکیبی کے بارے میں کچھ عرض کر دیا جائے،

بیمہ دراصل ایک اجتماعی قسم کا معاشی معاملہ ہے، جو لوگوں کی ایک جماعت کے مابین خاص معاہدے سے وجود میں آتا ہے ابتداء میں وہ اس وقت ظہور پذیر ہوا جب کچھ تاجر قسم کے لوگوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ ہم میں سے ہر ایک، اپنے مال کی مقرر مقدار ایک مشترک فنڈ میں اس غرض و مقصد سے جمع کرے گا کہ اگر ہم میں سے کسی کو متعین مدت کے اندر خاص طرح کے متوقع حادثے سے نقصان پہنچا تو اس مشترک فنڈ سے ایک حد تک اس کے نقصان کی تلافی کر دی جائے گی، ابتداء میں یہ معاملہ، انجمن امداد باہمی کی شکل میں تھا جس کا ہر شریک تحفظ دینے والا بھی تھا اور تحفظ لینے والا بھی، ان کے علاوہ کوئی ایسا شخص یا ادارہ نہ تھا جو بیمہ کرنے کرانے کا کام انجام دیتا ہو لیکن آگے چل کر بیمہ کمپنی کے نام سے ایک مستقل کاروباری ادارہ وجود میں آیا جس نے حصول نفع کی خاطر یہ کاروبار شروع کیا شروع میں اس کا دائرہ کار چند چیزوں تک محدود تھا لیکن بعد میں اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہوا کہ اس نے معاشی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور یہ خاص طور پر ایسے ملکوں و معاشروں میں پھیلا جن میں رائج معاشی نظام، سرمایہ دارانہ تھا جس میں نفس ربو اور قمار پر کوئی قدغن اور پابندی نہیں۔ آج بیمہ کی وہ ابتدائی شکل بہت کم کہیں پائی جاتی ہے جسے میوچل بیمہ کا نام دیا گیا تھا، عام طور پر ہر جگہ بیمہ کمپنیوں والا بیمہ ہی پایا جاتا ہے۔ بیمہ کمپنیاں تجارتی بنیاد پر بیمہ کا کاروبار چلاتی ہیں کچھ کمپنیاں اشیاء کا بیمہ کرتی ہیں اور کچھ زندگی اور ذمہ داریوں کا بیمہ اور اس کے لئے ان کا جو طریق کار ہے اسے سب جانتے ہیں وہ لوگوں سے اس قانونی عہد کے ساتھ یکمشت یا قسط وار رقمیں لیتی ہیں کہ اتنے عرصہ میں ان کی فلاں اشیاء یا جانوں کو متوقع حادثے یا موت سے نقصان پہنچا تو کمپنی اس حد تک اس نقصان کو پورا کرنے کی ذمہ دار ہوگی اور اتنی رقم ادا کرے گی، اشیاء کے بیمہ میں متوقع حادثہ رونما نہ ہونے کی صورت میں ادا کی ہوئی رقم بیمہ دار کو واپس نہیں ملے گی بلکہ کمپنی کی ملکیت ہو جائے گی، اسی طرح زندگی کے بیمہ میں اگر بیمہ دار نے کچھ پیسے ادا کرنے کے بعد مزید قسطیں دینی بند کر دیں تو اس کی ادا شدہ قسطوں کی رقم بھی اس کو واپس نہیں ملے گی بلکہ کمپنی کے حق میں ضبط ہو جائے گی۔ بہرحال بیمہ کمپنی اپنے بیمہ داروں سے جو معاملہ کرتی ہے وہ مالی لین دین کا قانونی معاملہ ہوتا ہے۔ بیمہ دار کمپنی کو جو مال دینے اور کمپنی اپنے بیمہ داروں کو بعض صورتوں میں جو مال دیتی ہے وہ تبرع و احسان کے طور پر نہیں ہوتا بلکہ معاوضے کی خاطر اور معاوضے کے طور پر ہوتا ہے کمپنی یہ چاہتی ہے کہ بیمہ داروں سے لئے ہوئے مال کا کم سے کم حصہ وہ بیمہ داروں کو دے اور باقی اس کو مل جائے اسی طرح بیمہ دار بھی یہی چاہتا ہے کہ اس نے کمپنی کو جتنا مال دیا ہے اس سے زیادہ اس کو مل جائے لہذا اس معاملے کو کسی طرح تبرع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا معاملہ نہیں کیا جا سکتا جو کہتا ہے وہ تبرع کے مفہوم سے جہالت کا ثبوت پیش کرتا یا لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے، بہرحال یہ مالی لین دین اور معاوضے کا معاملہ ہے البتہ اس میں لین دین اور معاوضے کی وہ صورت نہیں ہوتی جو بیع و شراء کے تجارتی معاملے میں ہوتی ہے بیع و شراء اور خرید و فروخت کے معاملہ میں ہر فریق کے لئے اس کے مال کا معاوضہ یقینی ہوتا ہے جبکہ بیمہ کے معاملہ میں بالخصوص اشیاء کے بیمہ میں معاوضے کا ملنا یقینی نہیں ہوتا بلکہ بیمہ کے معاملہ میں لین دین اور معاوضے کی صورت تقریباً وہ ہوتی ہے جو قمار اور جوئے کے معاملہ میں ہوتی ہے۔ جنرل بیمہ یعنی اشیاء کے بیمہ کے شرکاء میں سے ان کو ان کے دیئے مال کا کچھ معاوضہ نہیں ملتا جو مدت بیمہ کے اندر متوقع حادثے اور اس کے نقصان سے محفوظ رہتے ہیں اور جو متوقع حادثے کا شکار ہو کر مالی نقصان اٹھاتے ہیں ان کو کبھی ان کے دیئے ہوئے مال سے معاوضہ کم اور کبھی زیادہ مل جاتا ہے اور یہ چیز بیمہ کی سب قسموں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے خواہ وہ تعاون اور امداد باہمی کی قسم کا بیمہ ہو یا تجارتی بیمہ کمپنیوں سے تعلق رکھنے والا رواجی بیمہ، ہر ایک میں بعض شرکاء کو ان کے دیئے ہوئے مال کا معاوضہ کبھی بالکل نہیں ملتا اور کبھی ملتا ہے تو کمی بیشی کے ساتھ ملتا ہے پورا معاوضہ نہیں ملتا اور اس کا دار و مدار اتفاقات اور غیر اختیاری حالات پر ہوتا ہے۔

بیمہ کے اس معاہدہ اور معاملہ کے متعلق شرعی حکم کیا ہے جواز کا ہے یا عدم جواز کا اس بارے میں اپنے علم و فہم کے مطابق کچھ عرض کرنے سے پیشتر یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جب دنیا میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور اور قرآن مجید کا نزول ہوا اس وقت عرب معاشرے میں بیمے کا یہ معاملہ کسی شکل میں بھی موجود نہ تھا لہٰذا نہ قرآن مجید میں جزوی صراحت کے ساتھ اس کا کوئی ذکر ہے اور نہ احادیث نبویہ میں صریح طور پر اس کا کوئی بیان، اسی طرح آگے چل کر جب ائمہ مجتہدین نے فقہ کی تدوین فرمائی اس وقت بھی ان کے سامنے کہیں بیمہ کا معاملہ موجود نہ تھا لہٰذا ان کی کتابوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا، متقدمین کی کتب فقہ میں ہی نہیں بلکہ متاخرین فقہاء کی کتابوں میں بھی اس کے متعلق کوئی بحث موجود نہیں، علامہ شامی ابن عابدین نے جن کی وفات ۱۲۵۲ھ میں ہوئی اپنی مشہور کتاب ردالمحتار میں پہلی دفعہ سوکرہ کے نام سے بیمہ کی ایک شکل کا ذکر کیا اور اسے شرعاً ناجائز بتلایا ہے ان کے سامنے بھی بیمہ کی یہ شکل موجود نہ تھی جو آج تجارتی بیمہ کمپنیوں کے وجود سے قائم اور برسرکار ہے۔ جہاں تک میرے مطالعے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں گذشتہ نصف صدی میں مختلف علماء کرام نے اس کے متعلق لکھا جب ان کے ہاں یہ معاملہ مغرب کی تقلید میں رائج ہوا اور بروئے کار آیا، کسی نے اسلام کی رو سے اس کو جائز کہا اور کسی نے ناجائز، کسی نے اس کی بعض شکلوں کو جائز اور بعض کو ناجائز لکھا بلکہ اب تک یہ اختلاف زور و شور کے ساتھ چل رہا ہے۔ بہرحال جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا قرآن و حدیث میں جزوی صراحت کے ساتھ اس معاملہ کے متعلق کوئی مذکور نہیں کہ یہ جائز ہے یا ناجائز البتہ قرآن و حدیث میں عام شرعی حیثیت کا تعین کیا جا سکتا ہے، عام معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز اور درست و نادرست سے متعلق قرآن و حدیث کا وہ کلی تصور اور اصولی ضابطہ کیا ہے اور اس سے معاملہ بیمہ کے متعلق جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شرعی حکم مستنبط ہوتا ہے وہ کیا ہے ؟ اسے پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ بیمے کا یہ معاملہ، ان معاشی معاملات میں سے نہیں جن کی ہر انسانی معاشرے میں ہمیشہ ضرورت رہتی اور جن کے بغیر قومی معیشت کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی جیسے خرید و فروخت کا تجارتی معاملہ کہ اس کی ہر انسانی معاشرے میں ہمیشہ ضرورت رہتی حتی کہ اس کے بغیر معیشت کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی جبکہ بیمے کا معاملہ ایسا معاشی معاملہ ہے جو بعض معاشروں اور ملکوں میں پایا جاتا اور بعض میں نہیں پایا جاتا، مثلاً آج بیمے کا معاملہ ان ملکوں اور معاشروں میں تو متعدد شکلوں سے موجود ہے جن کا معاشی نظام اور اقتصادی سسٹم کیپٹلزم اور سرمایہ دارانہ ہے لیکن ان ملکوں اور معاشروں میں داخلی طور پر کہیں موجود نہیں جو سوشلسٹ اور جن کا معاشی نظام سوشلزم ہے اور اشتراکیت ہے حالانکہ ان کی قومی اور اجتماعی معیشت کی گاڑی خوب اچھی طرح چل رہی ہے بلکہ ان کے ہاں بیمہ کا کاروبار قانوناً ممنوع ہے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ یہ چاہتا ہے کہ بلا کسی تخصیص و امتیاز معاشرے کے ہر ہر فرد کو وہ بنیادی معاشی ضروریات لازماً میسر ہوں جن کے بغیر عام طور پر ایک انسان اپنی طبعی عمر تک نہ اطمینان کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے اور نہ اپنے متعلقہ فرائض ٹھیک طریقہ سے ادا کر سکتا ہے جو مختلف حیثیات سے اس کے ذمہ پر عائد ہوتے اور جن کی ادائیگی پر معاشرے کے قیام و بقا کا دار و مدار ہوتا ہے، اور پھر اس کے لئے وہ ضروری ٹھہراتا ہے کہ معاشرے کے جو افراد خود کام کرنے اور کمانے کی قدرت و صلاحیت رکھتے ہوں ان کے لئے کام اور کمانے کے مواقع مہیا ہوں نیز ان کے کام کی کم از کم اتنی اجرت ضرور لگائی جانے جس سے ان کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکتی ہوں یعنی گو سادہ سے سادہ شکل اور معمولی معیار سے سہی لیکن اس اجرت سے ان کی غذا، لباس، رہائش، علاج اور ایک حد تک تعلیم کی ضرورتیں پوری ہو سکیں، اور جو افراد کسی عذر اور مجبوری کی وجہ سے خود کام کرنے اور کما سکنے کے قابل نہ ہوں اور مفلس و نادار بھی ہوں تو اسلام ان کی معاشی کفالت کی ذمہ داری، معاشرے کے غنی و مالدار افراد پر ڈالتا اور ان پر لازم ٹھہراتا ہے کہ خود براہ راست یا حکومت کے توسط سے ایسے محتاج و نادار افراد کی معاشی ضروریات کا انتظام کریں خوہ زکواہ و صدقات کے مال سے ہو یا تبرعات کے مال سے تاکہ وہ بھی اطمینان کے ساتھ زندہ رہ سکیں۔

اور پھر چونکہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ معاشرے کے غنی و خوشحال افراد ناگہانی حادثے اور ارضی سماوی آفت کی زد میں آکر نقصان اٹھاتے اور پریشان ہو جاتے ہیں ایسی صورت میں ان کے لئے اسلام کی ہدائت یہ ہے کہ وہ اس مصیبت کو اللہ کی طرف سے ابتلاء سمجھ کر اور یہ اعتقاد رکھتے ہوئے کہ یہ رحمان و رحیم اللہ کی طرف سے ہے لہذا اس میں ضرور ہماری کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی صبر و سکون سے کام لیں اور رضا بر قضا کا مظاہرہ کریں اس سے ان کو اللہ کی رضا اور خاص رحمت و مہربانی حاصل ہوگی جو بندہ مومن کے لئے اللہ کی بڑی نعمت ہے اور پھر اگر ان کو اس حادثے اور آفت سے اتنا نقصان پہنچا ہے کہ وہ مفلس و نادار ہو کر رہ گئے ہیں تو اسلام معاشرے کے دوسرے غنی و خوشحال پر لازم ٹھہراتا ہے کہ وہ زکوۃ صدقات اور قرض حسنہ کے اموال سے ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مفلس و نادار افراد کی مدد کریں اور ان کو ایسا معاشی سہارا دیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں، اور اگر صورت حال یہ ہو کہ حادثے سے یہ نقصان اٹھانے کے بعد بھی کوئی شخص غنی ہی ہو جیسا کہ لاکھوں پتی چند ہزار کا نقصان اٹھانے کے بعد بھی غنی و مالدار رہتا اور اس پر زکاۃ دینی واجب ہوتی ہے تو ایسے شخص کے نقصان کی تلافی کرنا معاشرے کے دوسرے افراد کی ذمہ داری نہیں ہوتی نہ وہ زکاۃ و صدقات کے مال سے اس کی مدد کر سکتے ہیں کیونکہ وہ غنی ہے نہ اپنے دوسرے مال سے اس کو دینے کے پابند ہیں، یہ الگ بات ہے کہ اس کا کوئی دوست یا رشتہ دار بطور احسان اس کے نقصان میں حصہ لیتا اور اپنی مرضی سے اس کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہے تو اسلام اس سے نہیں روکتا بلکہ اس وجہ سے مستحسن قرار دیتا ہے کہ اس سے تعلق میں پختگی اور خوشگواری رونما ہوتی ہے جو اچھی چیز ہے۔

اسی طرح اگر معاشرے کے کچھ غنی و مالدار لوگ مل کر اس غرض سے ایک فنڈ قائم کرتے ہیں کہ ہم سے کسی کو فلاں حادثے کی وجہ سے نقصان پہنچا تو اس حد تک اس کے نقصان کی تلافی کر دی جائے گی تو اسلام اس قسم کے معاہدہ بیمہ سے بھی نہیں روکتا بلکہ یہ واضح رہے کہ اسلام اس طرح کے معاہدہ بیمہ کو غیر اہم اور غیر ضروری قرار دیتا اور اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا کیونکہ اس کے ہونے نہ ہونے سے معاشرے کی اجتماعی فلاح و بہبود پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، اس سے نہ ملک کی مجموعی دولت و ثروت میں کچھ اضافہ ہوتا ہے نہ اجتماعی سکون و اطمینان کو کوئی فروغ ملتا ہے، اس سے بعض افراد کو انفرادی طور پر ضرور فائدہ پہنچتا ہے لیکن اسلام میں اس کی اس لئے اہمیت نہیں کہ بعض افراد کو فائدہ تو معاملہ ربو اور قمار سے بھی پہنچتا ہے لیکن اسلام ان کو حرام اور ممنوع ٹھہراتا ہے، مطلب یہ کہ کسی چیز کے رواج سے معاشرے کے کچھ افراد کو فائدہ پہنچنا اس چیز کے اچھے اور مستحسن ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا، اسلام چونکہ شخصی اور انفرادی مفادات کے مقابلہ میں اجتماعی مفاد کو ترجیح دیتا اور اپنے احکام میں اس کو ملحوظ رکھتا ہے لہذا بیمہ جیسے معاملات کو پسند نہیں کرتا اور کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا، اس لئے بھی کہ اسلام معاشرے میں جو معاشی اعتدال و توازن قائم کرنا چاہتا ہے بیمہ جیسے معاملات اس کے لئے کسی درجہ میں بھی ضروری اور مفید ثابت نہیں ہوتے۔

اب میں اس اصولی اور کلی تصور کی طرف آتا ہوں جو قرآن و حدیث میں عام معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز سے متعلق دیا گیا ہے، وہ یہ کہ جو معاشی معاملات عدل و قسط کے مطابق اور جن میں ہر فریق کو اس کے مال کا ضرور اور پورا معاوضہ ملتا ہے وہ جائز درست ہے اور جو ایسے نہیں یعنی ان میں ہر فریق کو اس کے مال کا معاوضہ نہیں ملتا یا قدر و قیمت کے لحاظ سے پورا اور مساوی نہیں ملتا وہ ناجائز و نا درست ہیں یہ اس وجہ سے کہ پہلی قسم کے معاملات میں پورا حق ملنے کی بنا پر ہر فریق کی حقیقی رضامندی موجود ہوتی ہے جو معاملہ کی صحت کے لئے لازمی شرط ہے جبکہ دوسری قسم کے معاملات میں وہ اس وجہ سے موجود نہیں ہوتی کہ ان میں ہر فریق کے لئے اس کا پورا حق محفوظ نہیں ہوتا جو حقیقی رضامندی کی معروضی علامت ہے، یہ اصولی تصور قرآن مجید کی جن آیات سے ثابت اور مفہوم ہوتا ہے ان میں سے ایک سورہ النساء کی یہ آیت ہے: یاایھا الذین امنو لا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارہ عن تراض منکم * ترجمہ: اے وہ لوگوں جو ایمان سے مشرف ہو چکے ہو آپس میں ایک دوسرے کے احوال باطل و ناحق طور پر نہ کھاؤ مگر یہ کہ وہ ایسی تجارت کا طریقہ ہو جس میں فریقین کی حقیقی رضامندی پائی جاتی ہو۔

اس آیت میں لفظ باطل، حق کی ضد اور نقیض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ترجمہ ناحق کیا جاتا ہے بعض مفسرین کرام نے اس آئت کی تفسیر کرتے ہوئے باطل کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت حسن بصری کا یہ قول نقل کیا ہے: "الباطل ھو کل مایؤخذ من الانسان بغیر عوض"۔ باطل ہر وہ مال ہے جو کسی انسان سے بلا عوض لیا جائے۔ علامہ رشید رضا نے تفسیر المنار میں باطل کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے: اما الباطل مالم یکن فی مقابلہ شئی حقیقی "۔ ترجمہ: باطل وہ مال ہے جو کسی حقیقی شے کے مقابلہ میں نہ ہو۔ لہذا آئت مذکور کے پہلے حصے کا مطلب ہوا اے مسلمانو تم آپس میں ایک دوسرے کا مال بغیر عوض کے نہ لو اور چونکہ کسی مال کا صحیح عوض وہ ہوتا ہے جو مالیت اور قدر و قیمت میں اس مال کے برابر ہو لہذا کچھ واضح الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ مومنوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ لین دین کے معاملہ میں ایک دوسرے کا مال بغیر صحیح عوض کے لیں کیونکہ بغیر عوض کے دوسرے کا مال لینا باطل اور حرام ہے۔ سرقہ، غصب، خیانت، رشوت، قمار اور ربو بھی اسی وجہ سے حرام و ممنوع ہیں کہ ان میں ایک شخص دوسرے کا مال بغیر عوض کے لیتا اور حق تلفی کا مرتکب ہوتا ہے۔

آئت مذکور کے دوسرے حصہ میں الاحرف استثناء کے بعد باطل سے مستثنی جس معاشی معاملے کا بیان ہے وہ تجارت کا معاملہ ہے جس میں فریقین کی حقیقی رضامندی موجود ہو، ظاہر ہے کہ تجارت کے معاملہ میں ہر فریق کے لئے اس کے مال کا عوض موجود ہوتا ہے خریدار کے لئے جنس کی شکل میں اور دکاندار کے لئے نقدی و ثمن کی شکل میں، لیکن بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تجارت اور خرید و فروخت کے معاملہ میں ایک فریق دوسرے کو اس کی چیز کا جو عوض دیتا ہے وہ قدر و قیمت کے لحاظ سے دوسرے سے لی ہوئی چیز کی قدر و قیمت کے برابر نہیں ہوتا، ایسا بعض دفعہ جھوٹ اور دھوکے کی وجہ سے ہوتا ہے اور بعض مرتبہ کسی مجبوری کی بنا پر ہوتا ہے لہذا ایسی صورت میں اس فریق کی حقیقی رضامندی صرف اس وقت ہوتی ہے جب حقدار کو اس کا حق پورا اور ٹھیک ملتا ہے گویا پورے حق کا ملنا حقیقی رضامندی کا سبب بھی ہوتا ہے اور اس کے وجود کی علامت و دلیل بھی، کیونکہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ معاوضے کے طور پر لین دین کے معاملہ میں ہر فریق دل سے یہ چاہتا ہے کہ اسے اس کے مال کا ہر لحاظ سے پورا اور مساوی عوض ملے کم نہ ملے، چنانچہ جہاں وہ چاہت پوری ہوتی ہے وہاں خود بخود حقیقی رضامندی وجود میں آجاتی ہے، لہذا آئت مذکور میں تجارت کے ساتھ عن تراض منکم کے الفاظ یہ تقاضا کرتے ہیں کہ معاوضے اور تبادلے کے معاملہ میں ہر فریق معاملہ کو اس کے مال کا عوض و بدل ٹھیک اور برابر ملنا چاہیئے کیونکہ اس کے بغیر حقیقی تراضی موجود اور متحقق نہیں ہو سکتی جو معاملے کے حق اور صحیح ہونے کے لئے لازمی شرط ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض احادیث سے بھی یہی ظاہر اور ثابت ہوتا ہے کہ کسی کا مال اس کی رضامندی کے بغیر لینا حلال اور جائز نہیں، مسند احمد میں یہ حدیث مختلف طرق سے، روائت کی گئی ہے بعض کے کلمات ہیں لا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفس منه بعض کے الفاظ ہیں۔ لا یحل لامرء من مال اخیه شئی الا بطیب نفس منه اور بعض کے الفاظ ہیں۔ لا یحل لامرء من مال اخیه الا ما طابت به نفسه الفاظ کے معمولی اختلاف کے باوجود سب روایات کا مضمون یہی ہے کہ کسی کا مال اس کی حقیقی مرضی خوشی کے بغیر لینا حلال اور جائز نہیں اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا مالی لین دین کے معاملہ میں حقیقی مرضی خوشی کے جاننے کا معروضی معیار ہر فریق کو اس کے مال کا صحیح اور مساوی عوض ملنا ہے ورنہ ظاہری اور لفظی رضامندی تو معاملہ ربو جیسے قطعی ظالمانہ معاملے میں بھی موجود ہوتی ہے جو شخص دوسرے سے سود پر قرض لیتا ہے اپنی مرضی سے لیتا اور سود دیتا ہے اس کے باوجود یہ معاملہ اس لئے حرام ہے کہ اس میں قرضخواہ اپنے قرضدار سے قرض کی اصل رقم پر بطور سود جو زائد مال لیتا ہے اس کا کوئی مالی عوض اس کی طرف سے قرضدار کے لئے نہیں ہوتا لہذا وہ بلا عوض دوسرے کا مال لیتا ہے جو باطل اور ناحق کا مصداق ہے معاملہ ربو میں ایک شخص بغیر عوض کے دوسرے کا مال لیتا ہے اس کا اظہار بعض مفسرین کی ان عبارات سے بخوبی ہوتا ہے جو انہوں نے ربو کی تفسیر میں تحریر فرمائی ہیں بطور مثال چند پیش کرتا ہوں: تفسیر احکام القرآن میں علامہ جصاص حنفی کی عبارت ہے " ان تلك الزیادہ المشروطه انما كانت ربا فی المال العین لانه لا عوض لها من جهه القرض - " قرض کے اصل مال میں یہ مشروط زیادتی اس وجہ سے ربو ہے کہ مقرض یعنی قرض دینے والے کی طرف سے اس زیادتی کا عوض موجود نہیں ہوتا۔ علامہ ابوبکر ابن العربی مالکی اپنی مشہور تفسیر احکام القرآن میں لکھتے ہیں: المراد بالربو فی الآیه کل زیادہ لم یقابلها عوض " - آئت میں جس ربو کو حرام بتلایا گیا ہے اس سے مراد ہے ہر وہ زیادتی جس کے بالمقابل عوض نہ ہو۔ علامہ النسفی اپنی تفسیر مدارک التنزیل میں رقمطراز ہیں: الربو هو فضل مال خال عن العوض فی معاوضه مال بمال " مال کے بدلے مال کے معاوضہ میں وہ زائد مال جو عوض سے خالی ہو ربو ہے، تفسیر روح المعانی میں علامہ آلوسی کی تحریر ہے: الربو فی الشرع عبارہ عن فضل مال لایقابله عوض فی معاوضه مال بمال - شریعت میں ربو کا مطلب ہے مال سے مال کے معاوضہ میں وہ فاضل مال جس کے مقابلہ میں عوض نہ ہو۔ امام فخرالدین الرازی اپنی مشہور تفسیر الکبیر میں لکھتے ہیں: " الربو یقتضی اخذ مال الانسان من غیر عوض ربو کسی انسان کا مال بلا عوض لینے کا تقاضا کرتی ہے۔

چوٹی کے مفسرین کی مذکورہ عبارات و تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرے کا مال بغیر عوض کے لینا ربو کی ماھیت میں داخل اور اس کا لازمی جزو ہے اور یہی اس کے شرعاً حرام ہونے کی اصل وجہ ہے اس سے بجا طور پر یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ جس دوسرے معاشی معاملے میں یہ وجہ موجود ہو وہ بھی شرعاً حرام و ناجائز قرار پانا چاہیئے۔

دوسری قرآنی آئت جو مذکورہ اصولی و کلی تصور پر دلالت کرتی ہے سورہ بقرہ کی یہ آئت ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وان تبتم فلکم رؤوس اموالکم لاتظلمون ولاتظلمون * اور اگر تم ربو سے توبہ اور رجوع کر لو تو پھر تمہارے لئے تمہارے اصل مال ہیں نہ تم ان سے زائد لے کر دوسروں پر ظلم کرو اور نہ تمہارے اصل مال روک کر تم پر ظلم کیا جائے۔ اس سے پہلے کی آئت میں ربو کو نہ چھوڑنے والوں کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے یعنی جو لوگ ربو کو نہ چھوڑیں وہ یہ سمجھ لیں کہ وہ گویا اللہ اور اس کے رسول سے برسرپیکار اور مصرف جنگ ہیں، پھر اس آئت میں فرمایا کہ تم اگر ربو سے توبہ کر لو اور اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دو تو تمہارے لئے صرف تمہارے اصل مال ہیں ان پر زائد کچھ نہیں، اصل مال سے زائد لے کر نہ تم دوسروں پر ظلم کرو اور نہ دوسرے تمہارے اصل مال کو روک کر اس میں کمی کر کے تم پر ظلم کریں، اس سے معلوم ہوا کہ سودخوار اپنے مقروض سے قرض کے اصل مال پر جو بھی زائد مال لیتا ہے وہ اس کا حق نہیں بلکہ مقروض کا حق ہوتا ہے لہذا اس کا کچھ بھی زائد لینا مقروض کی حق تلفی اور اس پر ظلم کرنا ہے اور یہ کہ وہ زائد مال اس لئے اس کا حق نہیں ہوتا کہ اس کی طرف سے اس کا کوئی حقیقی عوض موجود نہیں ہوتا جو شرعاً اس کو اس زائد مال کا حقدار بناتا ہو اور چونکہ ربو میں معاملہ میں ایک فریق کی ضرور حق تلفی ہوتی ہے لہذا قطعی طور پر اس کو اسلام نے حرام ٹھہرایا اور اس سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔

قرآن مجید کی ان آیات سے بھی مذکورہ اصولی تصور کا خصوصی تعلق ہے جن میں خرید و فروخت کے اندر ماپ تول عدل کے مطابق پورا رکھنے کی تاکید اور بخس و تطفیف کی ممانعت ہے۔ مثلاً سورہ ھود میں ارشاد رب العزت ہے:

اوفوا المکیال و المیزان بالقسط ولاتبخسوا الناس اشیاءھم الایہ ترجمہ: ماپ تول انصاف کے ساتھ پورا رکھو اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو۔ سورہ الاسراء میں فرمایا اوفوا الکیل اذا کلتم و زنوا بالقسطاس المستقیم * جب ماپو تو ماپ پورا رکھو اور جب تولو تو صحیح و سیدھی ترازو سے تولو۔ سورہ المطففین میں ایسے لوگوں کے لئے عذاب کی وعید ہے جو جب اپنے لئے لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب دوسروں کو ماپ تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔

ان قرآنی آیات میں ماپ تول کے اندر کمی اور بخس و تطفیف سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ اس سے ایک فریق معاملہ کو اس کا واجبی حق پورا نہیں ملتا اور دوسرا بغیر عوض کے اس کی چیز لے لیتا ہے اور یہ مطلوبہ عدل کے خلاف اور ظلم ہے اس قسم کے احکام سے شارع کا منشا یہ کہ معاوضے کے معاملات میں ہر فریق کو اس کا حق ٹھیک ملے اور معاملہ سب کی حقیقی رضامندی سے طے پائے۔

قرآن و حدیث سے ماخوذ مذکورہ اصولی تصور اور قانونی ضابطے کی روشنی میں جب ہم مروجہ معاملہ بیمہ کا جائزہ لیتے ہیں جو تجارتی بیمہ کمپنیوں کی سرکردگی میں چل رہا ہے اور جو بلاشبہ تبرع کا نہیں مالی معاوضے کا معاملہ ہے تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ شریعت اسلامی کی رو سے یہ معاملہ باطل اور ناجائز ہے کیونکہ اس میں شریک سب شرکاء کو ان کے مال کا عوض نہیں ملتا بلکہ بعض بالکل محروم رہتے، بعض کو پورا عوض نہیں ملتا اور بعض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو زیادہ ملتا اور وہ بلا عوض دوسرے کا مال لے لیتے ہیں جو ان کے لئے حلال اور جائز نہیں ہوتا، سب جانتے ہیں کہ اشیاء کے بیمہ مثلاً موٹر کار کے بیمہ میں بیمہ دار بیمہ کمپنی کو جو یکمشت رقم ادا کرتا ہے مقررہ مدت میں جب حادثہ رو نما نہیں ہوتا تو وہ رقم اس کو واپس نہیں ملتی بلکہ وہ بلا کسی مالی معاوضے کے کمپنی کی ملکیت میں چلی جاتی ہے اور چونکہ اس میں بیمہ کمپنی کی طرف سے بیمہ دار کے لئے اس کی رقم کا کوئی حقیقی عوض موجود نہیں ہوتا لہذا اس کی حقیقی رضامندی مفقود ہوتی ہے اور مقررہ مدت میں حادثہ رو نما ہو جانے تو اس صورت میں بیمہ دار کو عموماً اس کی ادا کردہ رقم سے یا کم ملتی ہے یا زیادہ، اس کے برابر کبھی نہیں ملتی، اسی طرح مثلاً زندگی کے بیمہ میں جب بیمہ دار کچھ قسطیں کسی وجہ سے بند کر دیتا یا معاہدہ ختم کر دیتا ہے تو اس کی ادا کردہ اقساط کی رقم اس کو لوٹائی نہیں جاتی بلکہ بلا کسی حقیقی معاوضے اور رضامندی کے کمپنی اس کو اپنے کھاتے میں ڈال لیتی ہے، اسی طرح اس کے برعکس بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کمپنی بیمہ دار کو اس کے ادا کردہ مال سے کہیں زیادہ دے دیتی ہے مثال کے طور پر ایک شخص کی زندگی کا بیمہ ایک لاکھ روپے میں ہوتا ہے اور ایک قسط ادا کرنے کے بعد وہ مر جاتا ہے تو کمپنی اس کے ورثاء کو ایک لاکھ روپے دے دیتی ہے جبکہ اس نے مثلاً پانچسو روپے ادا کئے ہوتے ہیں حالانکہ اس بیمہ دار یا اس کے ورثاء کی طرف سے زائد رقم کا کوئی حقیقی عوض موجود نہیں ہوتا۔

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ بیمہ دار اور بیمہ کمپنی کے درمیان لین دین میں جو رضامندی ہوتی ہے وہ حقیقی رضامندی نہیں ہوتی جو شریعت میں مطلوب ہے بلکہ ایسی رضامندی ہوتی ہے جو جوئے کے معاملہ میں جوا بازوں کے درمیان ہوا کرتی ہے لیکن چونکہ جوئے میں جیتنے والا فریق ہارنے والے فریق کا جو مال لیتا ہے وہ بلا کسی حقیقی اور مالی عوض کے لیتا ہے جو اس کی عدم رضامندی پر دلالت کرتا ہے لہذا ظاہری رضامندی کے باوجود جوئے کا معاملہ شرعاً حرام و ناجائز ہے تو پھر بیمے کا معاملہ اس ظاہری رضامندی کی وجہ سے کیسے حلال اور جائز ہو سکتا ہے؟ دراصل حقیقی رضامندی کا اصل سبب جیسا کہ بار بار عرض کر چکا ہوں معاوضے کے معاملہ میں عوض کا پورا پورا اور لازمی ملنا ہے چنانچہ اس کے موجود نہ ہونے پر حقیقی رضامندی کے موجود ہونے کا دارو مدار ہے۔

مختصر خلاصہ یہ کہ اس میں کچھ شک نہیں مروجہ بیمے کا معاملہ جس کا تعلق بیمہ کمپنیوں سے ہے معاوضے کا معاملہ ہے اور معاوضے کے ہر معاملہ کی صحت و درستی کے لئے شرعاً از بس ضروری ہے کہ اس میں شریک ہر فریق کو اس کے مال کو ضرور اور پورا پورا عوض ملے لیکن بیمہ کے اس مروجہ معاملہ میں شریک ہر شخص کو اس کے مال کا معاوضہ نہیں ملتا، بعض کو بالکل ملتا ہی ہیں اور بعض کو کمی بیشی کے ساتھ ملتا ہے جن کو ان کے مال کا عوض بالکل ملتا ہی نہیں یا کم ملتا ہے ان کا مال بغیر ان کی حقیقی رضامندی کے بیمہ زندگی یا دوسرے بعض شرکاء کو مل جاتا ہے لہذا یہ معاملہ شریعت کی رو سے باطل اور ناجائز قرار پاتا ہے قطع نظر اس سے کہ اس میں غرر، قمار اور سود پایا جاتا ہے یا نہیں پایا جاتا، میرے استدلال کا تعلق اس اصل برائی سے ہے جس کی وجہ سے شریعت نے غرر، قمار اور سود کو حرام ٹھہرایا ہے جب وہ برائی بیمہ کے مروجہ معاملہ میں یقیناً پائی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاتی ہے تو وہی اس کے حرام و ناجائز ہونے کے لئے کافی ہے یعنی دوسرے کا مال بلاعوض اور بلا حقیقی رضامندی کے لینا جسے قرآن مجید نے اکل بالباطل سے تعبیر کیا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ کیا معاملہ بیمہ کی کوئی ایسی شکل بھی ہو سکتی ہے جو شریعت اسلامی کی رو سے جائز و درست ہو تو اس کا جواب یہ کہ ہاں ہو سکتی ہے اور وہ احسان و تبرع پر مبنی انجمن امداد باہمی کی شکل ہے جس میں شریک ہر شخص بیمہ فنڈ میں جو مال جمع کرے اپنے کسی مادی اور مالی فائدے کی غرض سے نہیں بلکہ محض انجمن کے دوسرے شرکاء کے فائدہ کی غرض سے جمع کرے، نیز وہ مال زکوٰۃ و صدقہ کی رو سے نہ ہو بلکہ ذاتی مال سے بطور احسان وہدیہ ہو کیونکہ یہ فنڈ جن لوگوں کی امداد کے لئے قائم کیا گیا وہ مساکین نہیں بلکہ اغنیاء ہیں جن کو صدقہ اور زکوٰۃ کا مال تو نہیں دیا جا سکتا البتہ ہدیہ اور ھبہ دیا جا سکتا ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، ایک حدیث نبوی ہے " تہادوا تحابوا آپس میں ایک دوسرے کو ھدیہ دو اور باہمی محبت پاؤ۔

اور چونکہ بیمہ کی مذکورہ شکل، معاوضے والی شکل نہیں جس میں شریک ہر شخص اور ہر فریق اپنے دیئے ہوئے مال کا مادی اور مالی معاوضہ چاہتا ہے یہ دوسری بات ہے جس شخص کو بیمہ کی مقررہ مدت میں متوقع حادثہ پیش نہیں آتا اس کو اس کے مال کا عوض نہیں ملتا، بلکہ یہ شکل تبرع و احسان والی شکل ہے جس میں شریک کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ اس کو اس کے دیئے ہوئے مال کا معاوضہ ملے اگرچہ مقررہ مدت میں متوقع حادثہ رونما ہو جائے تو اس کو دوسروں کی طرف سے مال مل جاتا ہے جو بطور عوض نہیں بلکہ بطور احسان و تبرع ہوتا ہے۔ بہرحال یہ اس کا مقصود نہیں ہوتا اور مقررہ مدت میں متوقع حادثہ رونما نہ ہو تو اس کو دیا ہوا مال واپس نہیں ملتا بلکہ بلاعوض دوسروں کو مل جاتا ہے اور دوسروں کو مل جانے سے اس کی کوئی حق تلفی واقع نہیں ہوتی کیونکہ اس نے جس وقت اپنا مال بیمہ فنڈ کو بطور تبرع و احسان دیا اسی وقت وہ اپنے حق سے دستبردار ہو گیا چنانچہ جب حق ہی نہ رہا تو پھر حق تلفی کا کیا سوال، اس ـ میں گرچہ اس کے سامنے کوئی مادی اور مالی عوض نہیں ہوتا لیکن ایک معنوی عوض ضرور موجود ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس احسان کی بدولت انجمن کے ارکان سے اس کے تعلقات زیادہ خوشگوار اور اطمینان بخش ہوں گے اور عزت میں اضافہ ہو گا جس طرح کہ مسکین کو صدقہ دینے والے کے سامنے اگرچہ کوئی مادی عوض نہیں ہوتا لیکن اللہ کی رضا و خوشنودی اور اخروی اجر و ثواب کی صورت میں معنوی اور روحانی عوض موجود ہوتا ہے لہذا اس کی حقیقی رضامندی پائی جاتی ہے۔

احسانی بیمہ کی جو شکل اوپر عرض کی گئی ہے اگرچہ ناممکن العمل نہیں لیکن آج معاشرے کے عام طور پر جو ذہنی اور خارجی حالات ہیں ان میں اس پر عمل کرنا خاص مشکل اور دیر طلب کام ضرور ہے مسلسل اور بھرپور کوشش کرنے سے انشاء اللہ ضرور کامیابی ہو سکتی ہے کیونکہ یہ شکل میوچل بیمہ سے کچھ ملتی ہے جو بعض ممالک میں عملاً قائم اور رائج ہے۔

© rasailojaraid.com